جلد01شمارہ17،2024

Article

The Concept of Majeed Amjad “Amoroz”

مجید امجد کا تصورِ امروز

Dr. Muhammad Naveed[1], Dr. Tahira Siddiqa [2]
[1] Head of Urdu and Regional Languages Department, Karakoram International University, Gilgit Baltistan.
[2] Assistant Professor, Department of Urdu , Kinnaird College For Women University, Lahore
*Correspondence: muhammad.naveed@kiu.edu.pk

ڈاکٹر محمد نوید[1] **ڈاکٹر طاہرہ صدیقہ** [2]

[1] صدر شعبہ اردو و علاقائی زبانیں، قراقرانٹر نیشنل یونیورسٹی، گلگت بلتستان، [۲] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، کنئیرڈ کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور۔

Abstract:
Majeed Amjad is the prominent Urdu poet of the 20th century. He has significance in poetry subjects, style and technique. Impact of western poets P B Shelly, Keats and Wordsworth can be seen on his poetry. He has discussed philosophical thesis like life, death, time and space. This research article deals with his concept of (Amrooz). An effort has been made to elaborate his concept in the light of his poetry

Keywords: Majeed Amjad, Tasur Amrooz, Theory of Time and Space, familiar facts of the present age, harmony with things, love of nature, a voice of protest against all forms of exploitation.

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:19-۰٤-202٤
Accepted:08-۰٦-202٤
Online:۲۷-۰٦-202٤

Copyright: © 2023 by the authors. This is an access-open article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

مجید امجد بیسویں صدی کے جدید اُردو نظم گو شاعر ہیں جنھوں نے اُردو نظم میں موضوعاتی، اسلوبیاتی اور تکنیکی تجربات کیے اور یوں جدید اُردو شاعری میں معجزۂ فن اور تخلیقی جادو گری کی ایک نہایت خوب صورت مثال قائم کی۔ مجید امجد اپنے معاصر شعرا میں واحد ایسے شاعر ہیں جو حیات و ممات اور کائنات کے حقائق کا فلسفیانہ مشاہدہ کرنے اور اپنے قدیم تہذیبی و ثقافتی روایات کو عصرِ حاضر کے حالات سے ہم آہنگ کر کے مستقبل کی خوش خبریوں کا ادراک حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجید امجد کائنات میں پھیلی ہوئی باطل دُھند کے خلاف آواز کے جگنو اکٹھے کرتے ہیں کیونکہ وہ کائنات کے حکمران باطل اسلوب کو قبول نہیں کرتے۔ مجید امجد معاشرتی جعلی اقدار کو مسترد کر کے اپنے خوابوں کی سرزمین سے ایسا سورج اُگانے کے خواہشمند ہیں جو معاشرے کو تاریکی سے نجات دلا سکے۔ اُن کی شاعری میں انسانیت کی تحقیر کا درد سب سے گہرا ہے اور اس احساس کی شدت میں اُس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ انسان کو اہلِ زر کی غلامی میں مبتلا دیکھتے ہیں۔

مجید امجد کے مجموعہ کلام ''شبِ رفتہ'' کا انتساب ہی صبحِ نو کے نام ہے۔ اس مجموعے کی اولین نظم ''حرفِ اوّل'' میں اس کائنات کی کتنی چھنا چھن صدیوں، کتنے گھنا گھن گھومتے عالم کے کتنے مراحل کا مآل اک سانس کی مہلت قرار دیتے ہیں۔ مجید امجد اس مختصر اور فانی حیات میں جبر و استحصال میں جکڑے انسان کی قسمت دیکھ کر اس دنیا کو آہوں اور اشکوں کی دنیا قرار دیتے۔ اس دنیا کے سازِ غم دل میں پیہم درد کی نوبت ہی بجتی ہے۔ اس درد کے سمندر سے مجید امجد اپنی نظم کی ایک ایک سل تراشتے اور تمام عمر اسی اُلجھن میں گزار دیتے ہیں کہ یہ حرف و بیاں کا عقدۂ مشکل کیا شے ہے۔ اگرچہ اُن کے قلم سے کتنے ہی ترانے، فسانے اور لاکھوں مسائل ٹپکے مگر پھر بھی اُن کے دل کی حکایت دل میں رہی۔ نظم کے اختتام پر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

"بیس برس کی کاوشِ پیہم
سوچتے دن اور جاگتی راتیں
اُن کا حاصل:
ایک یہی اظہار کی حسرت!" (۱)

مجید امجد نے بہت ہی مختصر عرصے میں اردو شاعری میں وہ مقام حاصل کر لیا جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ اُنھوں نے سیاروں، ستاروں اور خلا میں پوشیدہ وُسعتوں اور تنہائیوں کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں محسوس کیا مگر اُنھیں زندگی کا ثبات امروز کی دھڑکنوں میں میسر ہوا۔ درختوں کی چھاؤں، چڑیوں کی چہچہاہٹ، پھولوں کی مہک، چوڑیوں کی چھنکار اور ننھے منے بچوں کی معصوم ہنسی کی آوازیں اُنھیں جینے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ مجید امجد وہ شاعر ہیں جو آنسوؤں سے شاداب دو چار دن اور آہوں سے معمور دو چار راتیں گزار کر تنہائی، بے کسی اور اداسی کے محسوسات کے ساتھ خاموشی سے ابدی نیند سو گئے مگر آج جدید اُردو نظم کی معتبر ترین و مُستند تخلیقی شخصیت کے طور پر کل عالم سے اپنی عظمت کا خراج اور تحسین وصول کر رہے ہیں۔

مجید امجد کی شاعری آفاقی شاعری ہے اور ان کا دائرہ فکر حیات و کائنات سے عصری مسائل تک محیط ہے۔ اُنھوں نے زندگی کے بے کیف و بے رنگ واقعات کو شاعری میں پرو دیا اور ریزوں میں تقسیم سائے میں تلاش کرتے رہے۔۔۔ اُنھوں نے بُور لدے چھتنار اشجار

کے کٹنے پر بے پناہ رنج کا اظہار کیا اور فطرت کے تمام رنگوں سے غیر مشروط محبت کی۔ مجید امجد نے اپنی دل کی دھڑکنیں دنیائے امروز کو عطا کیں ۔انھوں نے اپنی زندگی تو تاریکی میں گزاری مگر اُردو نظم کی مانگ چاند ستاروں سے مزین کر دیا اور جدید اردو نظم میں اس وقت جو رنگینی نظر آتی ہے وہ مجید امجد نے عطا کی ہے۔

جس عہد میں مجید امجد شاعری کر رہے تھے اس وقت مغرب میں جدیدیت کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور علامتی شاعری نے مغرب و مشرق کی ادبی فضا میں ایک ارتعاش پیدا کیا تھا۔ سب سے پہلے میرا جی اور ن۔م۔راشدؔ نے مغرب کے علامت نگار شعرا سے متاثر ہوئے لہٰذا ان دونوں شعرا کے ہاں خصوصاً راشدؔ کی شاعری میں ہمیں روایتی شاعری کے خلاف بغاوت کا رجحان نظر آتا ہے ۔ مجید امجد کے ہاں جدید مغربی اور فرانسیسی علامت نگار شعرا کے اثرات نہیں ملتے البتہ اُنھوں نے مغربی شعریات کا تصور کیٹس، شیلے اور ورڈزورتھ کی نظم سے اخذ کیا۔ مجید امجد کی نظم میں نئی ہیئتوں کی تخلیق کا محرک بہت حد تک شیلے کی شاعری ہے جس سے وہ متاثر نظر آتے ہیں۔ مجید امجد کی نظم میں میرا جی اور راشدؔ کی مانند علامت نگاری اور استعارہ سازی میں نامانوس مماثلتوں اور اجنبی نسبتوں کا استعمال نہیں ملتا، جس کی وجہ سے اُن کی شاعری ابہام کا شکار نہیں ہوتی۔ مجید امجد نے ورڈزورتھ کی شاعری سے یہ اکتساب کیا کہ نظم کا موضوع وہ مانوس حقائق ہوں جو گرد و پیش کی زندگی کی ضمانت ہیں اور جنھیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مجید امجد کی نظم میں انگریزی رومانوی نظم سے استفادے کے باعث محدود شکل میں خود مختار انا کا تصور ملتا ہے۔اُن کی نظموں میں اشیا سے گہری موانست کا رویہ ملتا ہے۔ تمام اشیا ایک ہی بنیادی حقیقت سے جُڑی ہوئی نظر آتی ہیں اب خواہ وہ اشیا ہوں یا شاعر خود، تمام چیزیں دکھ درد کے رشتے سے بندھی نظر آتی ہیں۔ مجید امجد کے حوالے سے یہ بات بہت اہم ہے کہ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا کہ وہ گرد و پیش کے مسائل اور سیاسی و معاشی حالات و واقعات کے بجائے اشیا اور مظاہر پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

مجید امجد کی نظم اپنے پرآشوب عہد سے لا تعلق ہیں اور اپنی نظریں عصری آشوب کے بجائے اشیا و عناصر پر مرکوز رکھے ہوئے ہیں لہٰذا وہ تیسری دنیا کی جاگتی ہوئی آنکھ میں اُبھرنے والے خوابوں کو اپنے آدرش کا حصہ نہ بنا سکے۔ اس اعتراض کے جواب میں مجید امجد کی بہت سی نظموں مثلاً ''جہان قیصر و جم''، ''رودادِ زمانہ''، ''کہانی ایک ملک کی''، ''درسِ ایام''، ''طلوع فرض'' ، ''یہیں پہ رہنے دے صیاد آشیانہ مرا''، ''راجا پرجا''، ''سفرِ درد'' اور ''قیصریت'' وغیرہ کے عنوانات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ تمام نظمیں اُن کے عہد کے مسائل اور حالات و واقعات سے ہی متعلقہ ہیں۔ ایک ایسا شاعر جو درختوں پر تیشے چلنے سے رنجیدہ ہو، جو پرندوں پر شکاری کے نشانہ لگانے سے مغموم ہوتا ہو اور کسی جانور کے اپنی بساط سے بڑھ کر بوجھ اُٹھانے سے اُس کے درد اور تکلیف کو اپنے دل میں محسوس کرتا ہو، آخر وہ انسانوں سے دکھ سکھ سے لاتعلق کس طرح رہ سکتا ہے۔ مجید امجد استحصال کی تمام صورتوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں لیکن زیادہ تر نعرے بازی اور باغیانہ انداز اختیار نہیں کرتے البتہ کبھی کبھار انسانوں کی بے کسی دیکھ کر اُن کے اندر غم و غصے کی ایک شدید لہر غالب آجاتی ہے اور وہ احتجاجی لہجہ اپنا لیتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال اُن کی نظم ''شاعر'' ہے جس میں وہ بے ربط سی زنجیر کی مانند دنیا کو رد کرتے ہوئے نہایت خود اعتمادی کے ساتھ اس کے متبادل ایک نئی دنیا کا تصور پیش کرتے ہیں:

"اگر میں خدا اس زمانے کا ہوتا

تو عنواں کچھ اور اس فسانے کا ہوتا" (۲)

اس نظم میں دنیا کو انسانی خواب اور خواہش کے مطابق نئے سرے سے تشکیل دینے کی آرزو ملتی ہے مگر شاعر کو سماجی مزاحمت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ شاعر خود آگاہی کے مظاہرے کے ساتھ انسانی سماج، انسانی حیات اور تقدیر سے متعلق کئی حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں جیسا کہ دکھ اور اجل انسان کی تقدیر ہیں۔

مجید امجد نے مجبور، بے کس اور دھتکارے ہوئے نچلے طبقے کے ساتھ اپنی نسبت قائم کی۔ وہ جب اس طبقے کے افراد کو مالدار طبقے کی غلامی کرتے دیکھتے تو اس تضاد کو انسانیت کے لیے زہر قاتل خیال کرتے۔ دولت کی اس غیر منصفانہ تقسیم کو وہ خلیفۃ الارض کے خلاف سازش سمجھتے، جس نے خود ساختہ خواجگی کے تصور کو پیدا کیا اور جہاں بندہ و آقا کی تمیز بنیادی شرط قرار پاتی ہے۔ دولت کی ہوس نے ایک طرف ملوکیت کی جڑوں کو مضبوط کیا اور دوسری جانب مذہب فروشوں کو آقائی عطا کر دی ہے۔ نظم ''یہی دنیا'' میں انھی خیالات کی عکاسی کی گئی ہے ۔مزدوروں کے دل سے یوں فغاں اٹھتے دکھائی گئی ہے جیسے فیکٹری کی چمنیوں سے دھواں نکلتا ہے۔ مجید امجد کی نظم '' راجا پرجا'' میں بھی اسی قسم کے رنج اور غم کا بیان ملتا ہے:

"راجے کا کل آج
سارا جہاں محتاج
سکھ دھن باج خراج
گدی ۔ مسند ۔
تاج"

"پرجا کا آج نہ کل
شاخ نہ پھول نہ پھل
بھٹکے دل کا دل
پھوکا ، پیاسا
شل (۳)

مجید امجد کی نظم ''جہانِ قیصر و جم'' میں بھی بے آبرو مفلسوں کی آہوں کا دھواں پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عدل و انصاف کی زنجیر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھری ہوئی اور انسانوں کا انبوہ کشکول بدست سر گرداں دکھائی دیتا ہے۔ مجید امجد اپنے دل کی بے قرار لہروں کے درمیان سے زوالِ ہستی کا یہ منظر دیکھتے ہیں مگر ان کے درد آمیز لہجے میں باغیانہ جذبے کا آہنگ شامل نہیں ہوتا کہ وہ ظلم کا جواب ظلم نہیں سمجھتے۔ اسی لیے

ترکش کے تمام تیر کھانے کے باوجود بھی زندگی سے بقااور صلح وآشتی کا سمجھوتا چاہتے ہیں۔یہ بات الگ ہے کہ ان کے قدموں میں گرنے والا خون اُن کے احتجاج کی علامت بن جاتا ہے۔

"اک زندگی کراہتے لمحوں میں ڈھل گئی
اک شمع موج اشک پر بجھ بجھ کے جل گئی
اک بے گہنہ پہ ظلم کی شمشیر چل گئی
خونی انی پر ایک جوانی مچل گئی" (۴)

مجید امجد کی شاعری میں زندگی اور موت کے دونوں کناروں کے درمیان سے ایک جزیرہ اُبھرتا ہے، وہ اس جزیرے کا شب وروز گہرائی سے مشاہدہ کرتے ہیں اور ایسے رازوں کا انکشاف کرتے ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ مجید امجد انسانی زندگی کے تسلسل کو قبول تو کرتے ہیں لیکن اس کی انفرادی منزلت کے فہم سے قاصر ہیں۔اُن کے نزدیک زندہ رہنے کی سعی برتر عمل ہے مگر خود زندگی اس عمل کے مقابلے میں پسماندہ معلوم ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں زندگی اور موت کے حقائق ہمرکاب ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ مجید امجد کے لیے زندگی کو موت اور موت کو زندگی سے علیحدہ کر کے پہچاننا مشکل ہے۔اُن کے ہاں یہ تصور زیادہ تر زندگی کے بے رنگ غلبے سے اُبھرا ہے۔وہ زندگی کو موت کا سایہ سمجھتے ہیں جو رفتہ رفتہ سمٹتا ہوا موت کے قدموں کے نیچے معدوم ہو جاتا ہے۔یہ امر قابل ذکر ہے کہ مجید امجد کی شاعری سے انسان کے لیے نفی ذات کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ وسیع تر معنوں میں زندگی کو مثبت اقدار کے حوالے سے اُجاگر کرنا چاہتا ہے لیکن خود زندگی اپنے غیر ثباتی عمل کے باعث اپنی افادیت کم کرتی ہے:

"ہم نے بھی اپنی نحیف آواز کو
شامل شورِ جہاں کرنا تو ہے
زندگی اک گہری کڑوی لمبی سانس
دوست پہلے جی بھی لیں مرنا تو ہے
موت کتنی تیرہ وتاریک ہے" (۵)

مجید امجد کی شاعری میں تصورِ وقت آغاز سے ہی ایک مسئلے کی صورت سامنے آتا ہے، جو بعد ازاں اُن کے کلام کے ایک بنیادی پہلو کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مجید امجد زندگی، اس کے مظاہر اور رویوں کی تفہیم وقت کے نظریے کے حوالے سے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

"امجد کی پوری شاعری پر وقت کا احساس حاوی ہے۔۔۔۔ وقت ایک ایسی ازلی اور ابدی قوت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو ساری کائنات کو چلا رہا ہے۔" (۶)

مجید امجد کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ مجید امجد کے ہاں وقت ایک ازلی اور ابدی قوت کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ انھوں نے وقت کو خدا کے متبادل کے طور پر اپنی شاعری میں برتا ہے۔ مجید امجد کا تصورِ وقت تاریخ سے منسلک ہے۔ کائنات کے سائنسی ارتقا اور تقویمی نتائج کے حوالے سے اُن کے یہاں انسانی زندگی اور اس کے عوامل پر وقت کے اثرات کا تجزیہ ملتا ہے۔ مجید امجد کے یہاں آغاز کی شاعری میں وقت کا وہی عام تصور ملتا ہے، جس میں زمان ایک دھارے کی مانند لمحہ لمحہ مستقبل کی جانب بڑھتا چلا جا رہا ہے اور واقعات اس دھارے میں فنا کی سمت بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی مثال اُن کی نظمیں ''دنیا'' اور ''سازِ فقیرانہ'' ہیں۔ اپنے تصور وقت کی وجہ سے مجید امجد فلسفی شاعر قرار نہیں پا سکتے کیونکہ اُن کی شاعری میں زمان و مکاں سے متعلق بنیادی فلسفیانہ سوالات کے جوابات یا اُن کی شرح نہیں ملتی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا کہنا ہے:

"کائنات کے ارتقا کے سائنسی تصورات مجید امجد کے ہاں پیش ہوئے ہیں،.....اصل یہ ہے کہ مجید امجد کو وقت کے تصورات سے نہیں، وقت کے اس عمل سے دلچسپی ہے، جو انسانی زندگی اور تاریخ میں وہ انجام دیتا ہے۔" (۷)

مجید امجد زمان کے بہتے دھارے کے خیال سے آگے بڑھے تو زمان کی دائروی گردش کا احساس اُن کے کلام میں دکھائی دینے لگا۔ اُن کے ہاں وقت کی دائری گردش کا احساس اُن کی نظم ''کنواں'' میں ملتا ہے:

"اور اک نغمۂ سرمدی کان میں آ رہا ہے، مسلسل کنواں چل رہا ہے
پیاپے مگر نرم رو اس کی رفتار، پیہم مگر بے تکان اس کی گردش (۸)

مجید امجد کے ہاں وقت کے دولابی چکر کا احساس اُن کی نظم ''پنواڑی'' میں ایک نئے رُوپ میں جلوہ گر ہوا ہے:

"شام کو اس کا کم سن بالا بیٹھا پان لگائے
ایک پتنگا دیپک پر جل جائے دوسرا آئے " (۹)

مجید امجد وقت کے تاریخی جبر، تسلسل اور غیر متغیر عمل کو سیاسی و سماجی ظلم، سطوت و حکومت اور جبر و استحصال کی علامت بناتے ہیں اس کی مثال اُن کی نظم ''رودادِ زمانہ'' ہے۔ وہ اپنے عصری آشوب سے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں۔ اُن کی نظم ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' میں ہالی خود آگاہ فرد کی مثال نہیں بنتا دکھائی دیتا۔ وہ اپنی نظم ''جاروب کش'' میں کانپتی ہوئی روحوں کو یہ آگاہی دلاتے ہیں کہ اس عفریت کے سائے سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے اگر تم سوچ سکو تو حیلۂ جاروب کے پر نوچ سکو۔

مجید مجد نے اپنی نظموں ''طلوع فرض'' سے ''پنواڑی'' اور ''کنواں'' و ''امروز'' میں وقت کے جس مخصوص تصور کو پیش کیا ہے، اس کے حوالے سے ڈاکٹر ضیاالحسن اپنے مضمون'' مجید امجد کی نظم ''امروز'' میں رقمطراز ہیں:

"یہ تصور اس لحاظ سے کلاسیکی ہے کہ اس میں زندگی کو ایک مثبت اور تخلیقی نظر سے دیکھا گیا ہے لیکن کلاسیکی ادوار کی صوفیانہ فکر کے بر عکس اس میں آئندہ زندگی کے بجائے موجودہ

زندگی کو اہمیت دی گئی ہے، گویا مجید امجد نے وحدت الوجودی فکر کے بجائے وجودی فکر سے اس نظم کا فکری دائرہ بنایا ہے۔ یہ نظم ۱۹۴۵ء میں تخلیق ہوئی جب اردو لکھنے والے ادیبوں نے وجودی فکر کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں سنا تھا۔ وجودی فلسفے کے حوالے سے ہمارے ادیبوں نے جدیدیت کی تحریک کے دوران میں یعنی ۶۰ء کی دہائی میں سوچنا، سمجھنا اور لکھنا شروع کیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مجید امجد اپنے ہم عصروں سے دو دہائیاں قبل ان موضوعات کو اپنی شاعری میں برت رہے تھے جو ہمارے مجموعی شعری کلچر میں بہت بعد میں داخل ہوئے۔" (۱۰)

نظم ''امروز'' میں مجید امجد نے یہ مرکزی خیال پیش کیا ہے کہ وقت ایک مسلسل روانی اور بہاؤ کا نام ہے اور ہر شے اس روانی کے ساتھ رواں دواں اور اس بہاؤ کے ساتھ بہتی چلی جا رہی ہے۔ وہ ماضی کے تاریک غاروں کی جانب نہیں دیکھنا چاہتے اور نہ ہی وہ مستقبل کی نامعلوم بھول بھلیوں کی نذر ہونا چاہتے ہیں۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ آنے والا وقت اور گزرا ہو وقت دونوں ہی ہماری دسترس سے باہر ہیں اور محض لمحہ موجود ہی ہماری ملکیت قرار پاتا ہے۔ اس لمحہ موجود کو ماضی میں گُم کر دینے یا مستقبل کے تفکرات کی بھینٹ چڑھانے کے باعث ہم ہمیشہ تہی دست رہتے ہیں۔ یہی لمحہ موجود ہے جو مسلسل ماضی بن رہا ہے اور مسلسل مستقبل سے حال اور حال سے ماضی میں بدلتا چلا جا رہا ہے لہٰذا لمحہ موجود ہی تمام زمانوں کا منبع قرار پاتا ہے۔ نظم ''امروز'' کا ایک حصہ ملاحظہ کیجیے:

"مجھے کیا خبر ہے وقت کے دیوتا کے حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں
مقدر کے کتنے کھلونے، زمانوں کے ہنگامے، صدیوں کے صد ہا ہیولے
مجھے کیا تعلق۔ میری آخری سانس کے بعد بھی دوش گیتی پہ مچلے
مہ و سال کے لازوال آبشارِ رواں کا وہ آنچل، جو تاروں کو چھو لے
مگر آہ یہ لحۂ مختصر۔ جو مری زندگی، میرا زادِ سفر ہے!" (۱۱)

مجید امجد نے نظم ''امروز'' کے اولین بند میں ابد کے سمندر کے استعارہ کے ذریعے وقت کے لامحدود تصور کا تجریدی بیان پیش کیا ہے۔ وقت کی لامحدودیت کے لیے سمندر ایک بہترین استعارہ ہے۔ سمندر اور وقت کے مابین مماثلت سے وہ ہمیں آگاہ کرتے ہیں اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسی بہت سی مماثلتیں کائنات کے تمام عناصر کے مابین موجود ہیں۔ ابد ایک لامحدود سمندر ہے، جس کی ایک موج وہ محدود زمانہ ہے جس میں ایک فرد ظہور کرتا ہے۔ مجید امجد اسی فرد کے ظہور کو کنول کے استعارے میں پیش کرتے ہیں۔ اس خیال کو وہ پھر موسیقی کے استعارے میں بھی پیش کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک وقت ایک ان سُنی غیر دریافت شدہ راگنی کا نام ہے، جس کی ایک تان یعنی انفرادی زندگی کا ظہور ہوتا ہے۔ زمانہ یا وقت بے کراں وسعتوں کا حامل ہے جس میں فرد کی زندگی دو چار لمحوں کی معیاد سے زیادہ نہیں ہے۔ اس زندگی میں خیر

اور شر ،اندھیرا اور اُجالا دونوں موجود ہیں اسی طرح غم اور مسرت زندگی سے منسلک ہیں لہذا انسان کو مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہیے کیونکہ حالات وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی کے مرحلے سے گزرتے رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا بند میں مجید امجد نے اولین بند کے تسلسل کو آگے بڑھایا اور اسی استعاراتی فضا کو برقرار رکھا ہے، جو اُن کی شاعری میں اثر اور خوب صورتی پیدا کرتی ہے۔اس بند میں انھوں نے وقت کو ایک دیوتا کی شکل میں پیش کیا ہے، جس کا حسین رتھ مسلسل رواں ہے۔وقت کے تسلسل اور روانی کے لیے یہ بھی ایک بہترین استعارہ ہے جو وقت کے مجرد تصور کو ہمارے سامنے ایک ٹھوس تصویری صورت میں پیش کرتا ہے۔مجید امجد نے لامحدود کو محدود کے سامنے رکھ کر اپنا نظریہ حیات پیش کیا ہے کہ محدود صرف اس صورت میں بامعنی ہے جب وہ اپنی محدودیت کو محسوس کرے اور اپنی محدودیت کے ہر لمحے کو استعمال میں لائے۔

مجید امجد اپنی شاعری میں بظاہر وقت کی لامحدودیت کے مقابل انسان کی چند روزہ حیات پر بے بسی کا احساس پیدا کرتے ہیں مگر دراصل وہ اس کے ذریعے سے انسان کی چند روزہ حیات کو استعمال کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔وقت کی لامحدودیت اور اس کے سامنے انسان کی محدودیت اور بے ثباتی ہمیشہ سے ہی ایک مقبول اور پریشان کن موضوع رہا ہے مگر مجید امجد ایسے شاعر ہیں جو ہمارے اندر مثبت توانائی پیدا کرتے ہیں کہ انسان کو پریشان ہو کر اس محدود وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے ہر پل سے لطف کشید کرنا چاہیے۔اگر مسرت کو ہیشگی اور دوام حاصل نہیں تو دُکھ درد اور غم بھی توقتی اور عارضی ہیں۔

مجید امجد کی ذات کی گہری جھیل میں ایسا ارتعاش محسوس ہوتا ہے جو غم کی تیز ہوا کے چلنے سے پیدا ہوتا ہے۔مجید امجد غم کی وُسعتوں کا ادراک کرتا ہوا اپنی ذات کے دائرے میں قید ہو جاتے ہیں۔اُن کی نظموں سے اُن کی ذاتی زندگی کا کرب جھلکتا ہے اور کہیں کہیں یہ کرب پھیلتا ہوا زندگی کے اجتماعی کرب کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔مجید امجد کو دکھ کی پھٹی ہوئی چادر میں لپٹے ہوئے انسانوں کا غم بھی گھیرے رہتا ہے۔یوں داخلی اور خارجی سطح پر غموں کے مدغم ہونے سے اُن کے یہاں غم کی تفریق کم دکھائی دیتی ہے۔مجید امجد اپنی ہوک اپنے سینے میں روکنا جانتے ہیں لہذا وہ اپنی محرومیوں اور تلخیوں کو اتنی شدت سے ظاہر نہیں ہونے دیتے، جس کا وہ تقاضا کرتی ہیں۔البتہ اُن کے یہاں زندگی کے کڑوے سانسوں کا احساس مٹتا نہیں۔

"زندگی اے زندگی

اس سلسلے میں مجید امجد کی نظمیں ''حرفِ اول''، ''مرے خدا مرے دل'' اور ''دنیا سب کچھ تیرا'' میں بھی اسی قسم کی کیفیات کی عکاسی ملتی ہے۔

مجید امجد کے کلام کو پڑھنے سے شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے غم میں ڈوب کر بھی دوسروں کے غم سے بے خبر نہیں رہتے۔اس کے علاوہ زمانے کے خونیں مناظر اُنھیں زندگی کے احساس سے محروم نہیں کرسکے۔وہ اپنے غموں کے لیے آہیں بھرتے ہیں تو دوسروں کے لیے اُن کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔اُن کی آنکھ کے آنسو تمام انسانوں کے غم کی ترجمانی کرتے ہیں۔اس حوالے سے اُن کی نظمیں'' پچاسویں پت جھڑ''، ''اے ری چڑیا'' اور ''نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب'' ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

مجید امجد اپنی نظموں میں محنت کش طبقے کی محرومیوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔وہ معاشرتی تشکیل سے نامطمئن ہیں جہاں انسان کی تذلیل کی جاتی ہے۔مجید امجد ایسے معاشرتی ڈھانچے کو تبدیل کرنے کے آرزو مند ہیں جہاں انسان جوہڑ کے کیڑوں کی مانند جینے کی کوشش میں مصروف ہے اور اپنے منصب سے محروم ہو چکا ہے۔وہ جبر کے شکنجے میں کسے ہوئے انسان کی رہائی چاہتے ہیں۔اُن کی نظم "کلبہ وایواں" میں گھاس کی گٹھڑی کے نیچے روشن چہرہ جس کا روپ شاہی ایوانوں کے پھولوں کو شرماتا ہے وہ بھیک کے اک ٹکڑے کو ترستی کھوئی کھوئی آنکھیں، جن کی پلکوں کے نیچے لاکھوں دنیاؤں کے سائے دکھائی دیتے ہیں۔نظم "مقبرہ جہانگیر" میں کھردرے میلے پھٹے کپڑوں میں بوڑھے مالی جو ہڈیاں سینچ کر پھلواڑیاں مہکاتے ہیں گھاس کٹتی ہے کہ دن ان کے کٹے جاتے ہیں۔"ہڑپے کا ایک کتبہ" میں ہل چلانے والے انسان کے ماتھے سے دکھوں کے ریکھ مٹانے کی آرزو رکھتے ہوئے مجید امجد کہتے ہیں کہ ہل چلانے والے کے لیکھ بھی جانوروں جیسے ہیں گویا تپتی دھوپ میں دو بیلوں کے ساتھ یہ تیسرا بیل ہے۔اسی طرح مجید امجد کی نظمیں" بارکش "،اور" پہاڑوں کے بیٹے" بھی اسی قبیل کی ہیں۔

مجید امجد ایک دردمند دل کے مالک تھے جو درختوں کے کٹنے اور لالی کے بجلی کے تار پر جھولنے سے بھی اُداس اور پریشان ہو جاتے ہیں۔یہ دردمندی حیوانات،جمادات اور نباتات سبھی کو سمیٹ کر ایک دائرے میں لاتی ہے ۔ڈاکٹر سہیل احمد خاں کے بقول:

"اشیا کے ساتھ موانست اور ہمدردی کا رویہ مجید امجد کی کائنات میں نئی مظہریات کو تخلیق کرتا ہے۔"(۱۲)

مجید امجد کی شاعری سے یہ احساس ملتا ہے کہ آدرشوں کی پسپائی کے پس منظر میں اُمید کی کرن جگمگا رہی ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ روشنی اور حق کی خاطر لڑنے والوں کی صف خالی نہ ہو جائے،اسی لیے دنیا سے شکست کھانے کے بعد بھی اُن کے لبوں پر ایسی ہنسی کا گمان ہوتا ہے ،جس میں صداقت کا نور گھلا ہوا ہو:

"پھر میرا دل کیوں نہ دُکھے جب میں یہ دیکھوں،
میری سچائی کو سمجھنے والے
میری بابت اپنے علم کو جھٹلانے کی کوشش میں،ہر گری ہوئی رفعت کو اپناتے ہیں
پہلے میرے ہونے کو اپنے دل میں دفنا دیتے ہیں
اور پھر میرے سامنے آکر میرے سچ پر ترس کھاتے ہیں" (۱۳)

اس کے علاوہ اُن کی نظمیں "مورتی" اور "دنیا تیرے اندر" بھی اسی احساس کی غماز ہیں۔

مجید امجد فطرت سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔فطرت سے ان کی محبت کا اظہار اُن کی بہت سی نظموں میں ہوا ہے۔اسی لیے وہ فطرت کے قتل کو انسانیت کے قتل سے تعبیر کرتے ہیں۔"توسیع شہر" اس تناظر میں مجید امجد کی بہترین نظم ہے،جس میں وہ درختوں کو کٹنے کو خوشیوں کے قتل اور زندگی کا عظیم نوحہ قرار دیتے ہیں۔اس نظم میں گرتی ہوئی گھائل نیلے پیڑوں کی نیلی دیوار دکھائی دیتی ہے۔کٹتے ہیکل ،جھڑتے پنجرے،چھٹتے برگ و بار اور سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار نظر آتے ہیں۔جو شاعر درختوں کے کٹنے کو اس درجہ

افسردگی سے اور حساسیت سے محسوس کرتا ہے،اُس کی موانست اور ہمدردی کا رشتہ انسانوں کے ساتھ کیسا ہو گا اس کا کچھ اندازہ اس نظم سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

"اس مقتل میں صرف اِک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اِک ،اے آدم کی آل" (۱۴)

عصرِ حاضر میں ہماری متمدن اور صنعتی زندگی نے اشجار تو ایک طرف لہکتی ہوئی سوچوں کی ڈال کو بھی کاٹنے کا عمل شروع کر دیا ہے، ایسے میں مجید امجد نے درختوں کو ایک علامتی جہت دیتے ہوئے دراصل جدید دور کے انسان کی توسیعِ ہوس کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

عصرِ حاضر میں جن قومی مسائل کا شکار پاکستان ہے وہاں اسے مجید امجد کے تصورِ امروز سے راہنمائی اور تحریک حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں تعصب، منافرت اور انتہاپسندی کے گھٹن زدہ اس ماحول میں تازہ ہوا کے جھونکوں اور گلاب کے پھولوں کی ضرورت ہے جو ہمیں صرف مجید امجد کی شاعری میں مل سکتی ہیں ۔

" اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انھیں دے دوں جو بن پڑے" (
(۱۵

مجید امجد کی شاعری میں براہ راست ہمت اور حوصلے کی تبلیغ نہیں ملتی،اس کے لیے اُن کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کرنا اور فہم حاصل کرنا ضروری ہے۔اُن کی شاعری میں اکثر ننھے منے چھوٹے بچوں سے مکالماتی انداز بالواسطہ امید کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ مجید امجد خود کو ایسا ماضی قرار دیتے ہیں جو تاریکیوں اور ظلمتوں کی دلخراش رُوداد کے سوا کچھ اور نہیں۔ ننھے بچوں سے گفتگو کے ذریعے دراصل مجید امجد اپنی تاریک زندگی کے سناٹے میں روشن صبح کا خواب دیکھتے ہیں۔ زندگی کے آخری زینے پر یہ خواب ہی اب اُن کا آخری سہارا بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ خود غم کی دھند میں لپٹے ہوئے مگر آنے والے دور میں اگلی نسل کی خوشیوں کو محسوس کر سکتے ہیں، جو کل ان کے گمنام مرقد کے قریب سے بے خبری کے عالم میں گزر جائیں گے کہ وہ جس ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں، اس میں ان کے لیے کسی گھائل دل کی دعا گھلی ہوئی ہے۔

مجید امجد کی شاعری میں چھوٹے بچوں سے گہری محبت کا ایک اور سبب اُن کی معصومیت سے عقیدت کا مظاہرہ بھی ہے۔ چھوٹے معصوم بچے کی فطرت صاف شفاف سمندر کے سینے پر چلنے والی ہوا کی مانند بے داغ اور اُجلی ہوتی ہے۔ چونکہ مجید امجد اور اُن کی نسل کی زندگی مسموم حبس کی نذر ہو گئی لہذا وہ نژادِ نو کے توسط سے فطرت کی شفاف بانہوں ہیں آخری سانس لینا چاہتے ہیں۔ وہ وسیع تر ارض اور بے کراں آسمانوں کی وسعت کو بے مقصد گردانتے ہیں اگر ان میں معصوم بچوں کی مسکراہٹ اور ان کی ہنسی کی آواز شامل نہیں ہوتی۔

مجید امجد کے نزدیک زمانے کا سارا زہر انھوں نے اور ان کے ہم سفروں نے چُوس لیا ہے اب معصوم بچے ایسی زمینوں پر اپنے قدم رکھیں گے جو ان کے خوابوں سے مہک رہی ہو گی:

"ننھے بچو کل جب تم اس عمر میں ہو گے میں جس عمر میں ہوں

تب وہ لوگ جو تم سے بڑے تھے
کبھی کے مٹی اوڑھ کے سارے سو بھی چکے ہوں گے
جانے تم اس وقت ہمارے بارے میں کیا سوچو گے
شاید وہ دن بڑے کٹھن ہوں پھر بھی اتنا کچھ تو یاد رکھو گے
کیسے لوگ تھے خود تو اپنے لہو میں ڈوب گئے
لیکن اس مٹی پر آنچ نہ آنے دی
جس پر آج تمھاری آرزوؤں کے باغ مہکتے ہیں" (۱۶)

مجید امجد کی نظمیں ''پھولوں کی پلٹن ''، ''اس دن اس برفیلی تیز ہوا۔۔''، ''نژادِ نو''، ''ننھی بھولی'' اور ''ہم تارے، چاند ستارے ہیں'' چھوٹے بچوں سے محبت کے ساتھ ساتھ نامساعد حالات میں بھی امید، حوصلے، مستقل مزاجی اور یقین کا اظہار ہیں۔

مجید امجد کے فن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وقت، کائنات، تخلیقِ آدم، عروج و زوال اور انسانی معاملات وغیرہ کے حوالے سے بہت سے اہم سوالات اُٹھاتے ہیں لیکن ان کی فکر کا آخری تاثر تسلیم و رضا ہے جب وہ کائناتی گورکھ دھندوں سے نکل کر زندگی کے حقائق کو تسلیم کر کے زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں اور خوشیوں میں زندگی تلاش کرتے ہیں۔ ''کنواں'' اور ''امروز'' جیسی نظموں میں فکر و فلسفے کی اُلجھنیں بھی ہیں لیکن وہ کائناتی وقت کے تناظر میں انسانی کم مائیگی پر ملول و افسردہ ہونے کے بجائے زندگی کو خوشی اور غم کے امتزاج کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ محسوسات اور فکر کا جو امتزاج مجید امجد کی شاعری میں ملتا ہے اور روزمرہ کی واقعات کو جس خوبصورت انداز میں انھوں نے پیش کیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

مجید امجد کی شاعری کسی انقلاب کا پرچار کرنے کے بجائے زندگی کی گہری حقیقتوں کی غماز دکھائی دیتی ہے۔ اُن کی شاعری عملِ خیر کے تسلسل کی شاعری ہے اور وہ اسے جاری رکھے رہے۔ اُن کی شاعری زمانی و مکانی حدود سے ماورا ہو کر ہر دور کے انسان کے لیے اخلاقی اقدار کا ایک لائحہ عمل ترتیب دیتی ہے جو انسانیت کے روشن مستقبل کی نوید ہے۔ مجید امجد کی ہمدردی اور دردمندی اُس انسان کے لیے ہے جو سیاسی و معاشی جبر کا شکار ہے۔ اُن کے نزدیک یہ مجبوریاں انسان کے ساتھ ازل سے وابستہ ہیں اور ان سے نجات کی کوئی صورت نہیں لیکن ایسی مجبوریاں جو سماج اور معاش کی زائیدہ ہیں، اُن کا علاج خود انسان کے اختیار میں ہے۔ مجید امجد اس مجبوری اور جبر کے خلاف جدوجہد کی تلقین کرتے ہیں کہ ان مسائل کا حل انسان کے ہاتھ میں ہے اگر وہ اپنے آج گردوپیش کے حالات اور معاملات کا ادراک رکھتے ہوئے ان کا حل نکالنے کی کوشش کرے تو کل روشن مستقبل کی خوش خبری پا سکتا ہے۔

~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~

حوالہ جات

۱۔ مجید امجد، ‘‘ حرفِ اول ’’، شبِ رفتہ، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۵۸ء، ص: ۱۱
۲۔ مجید امجد، ‘‘شاعر ’’، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور: فرید بک ڈپو، ۲۰۱۱ء، ص: ۴۳
۳۔ مجید امجد، ‘‘راجا پر جا’’، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ص: ۲۴۷
۴۔ مجید امجد، ‘‘سفرِ درد ’’، کلیاتِ مجید امجد، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ص: ۳۵۶
۵۔ مجید امجد، ‘‘ایک نظم ’’، کلیاتِ مجید امجد، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ص: ۹۱
۶۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، ‘‘چند اہم جدید شاعر ’’، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۳۰
۷۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ‘‘مجید امجد: شخصیت اور فن ’’، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص: ۵۰
۸۔ مجید امجد، ‘‘کنواں ’’، کلیاتِ مجید امجد، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ص: ۶۰
۹۔ مجید امجد، ‘‘پنواڑی ’’، کلیاتِ مجید امجد، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ص: ۸۹
۱۰۔ ضیاالحسن، ڈاکٹر، ‘‘مجید امجد کی نظم امروز، مشمولہ؛ مجید امجد یہ دنیائے امروز میری ہے (مقالات) مرتبین: ڈاکٹر محمد کامران، ڈاکٹر ضیاالحسن ، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، لاہور: شعبہ اُردو اور ینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء، ص: ۲۶۰
۱۱۔ مجید امجد، ‘‘امروز ’’، کلیات مجید امجد، مرتبہ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ص: ۱۰۰۔۱۰۱
۱۲۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر، ‘‘مجید امجد اور نئی شعری صورتِ حال ’’، مشمولہ؛ قند (مجید امجد نمبر) مئی جون ۱۹۷۵ء، ص: ۶۹
۱۳۔ مجید امجد، ‘‘اپنے لیکھ یہی تھے ’’، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ، خواجہ محمد زکریا، ص: ۵۵۴۔۵۵۵
۱۴۔ مجید امجد، ‘‘توسیع شہر ’’، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ، خواجہ محمد زکریا، ص: ۳۶۴
۱۵۔ مجید امجد، غزل، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ، خواجہ محمد زکریا، ص: ۳۳۸
۱۶۔ مجید امجد، ‘‘ننھے بچو ’’، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ خواجہ محمد زکریا، ص: ۴۵۱